R. No. 2186/AL

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 59

Telegrams "ANJUMAN"

ایک روپیہ سالانہ

ایک پرچہ

دس نئے پیسے

۱۳۔۱۰۔۰۱

علی گڑھ - ۸ / جون ۱۹۶۱ء	ایڈیٹر - آل احمد سرور	جلد ۲۰ - شمارہ ۲۲

ویریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

پنڈت اندرجیت شرما

۳/ دسمبر ۱۸۹۳ء کو بمقام کھر کھودہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی۔ ٹریننگ اسکول اور نارمل کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو کر پیشۂ معلمی اختیار کیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں میٹرک کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ ۱۹۲۵ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک ماچھیرہ مائنل اسکول میں انگریزی کے معلم رہے۔ پھر اسی اسکول میں سنہ ۱۹۳۰ء سے ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بچپن ہی سے فارسی، اردو اور ہندی کا بڑا سلجھا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ شاعری کی طرف رجحان طبع زیادہ تھا۔ جہاں تک اکتساب فن کا تعلق ہے آپ نے ندرت میرٹھی مرحوم سے استفادہ کیا ہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کا مجموعۂ کلام "نیرنگ فطرت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جو نصاب تعلیم میں شامل تھا۔ دوسرا مجموعہ بعنوان "جلوہ زار" سنہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ یہ دونوں مجموعے ملک میں بہت مقبول ہوئے۔ شرما جی ۶/ جولائی سنہ ۱۹۴۶ء میں ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ شرما جی نے اردو کے اساتذہ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور ان کی صحبتوں سے فیض بھی اٹھایا تھا۔ آپ بڑے سلجھے ہوئے نیک اور وضعدار انسان تھے ساری زندگی ایک سچے سپوت کی طرح اردو کی خدمت میں گذاری لیکن ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے پوری طرح آپکی خدمات کو فراموش کر دیا۔ ڈاکٹر سعید احمد سعید بریلوی مرحوم نے اپنے رسالۂ "کامیابی" دہلی میں ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۳ پر شرما جی کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"شرما صاحب آہستہ آہستہ اپنے لئے شعرائے ملک کی صف اولین میں جگہ نکال رہے ہیں اور وہ دن بہت دور نہیں کہ عروس کامیابی آپ سے ہمکنار ہوگی۔"

اندرجیت شرما کا رجحان غزل کی نسبت نظم کی طرف زیادہ تھا اور ان کی نظمیں کافی مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ شرما جی نے ہلکے پھلکے گیت بھی لکھے تھے جو زیادہ تر ریکارڈوں میں بھرے جا چکے ہیں اور یہ گیت ساغر نظامی اور شکیل بدایونی کے گیتوں سے حسن و خوبی کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک کامیاب اضافہ ہیں۔ ان کے گیتوں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی، احساس کی شدت بھی ہے اور جذبات کا وزن بھی۔ "ادبی دنیا" کے ایڈیٹر مولانا صلاح الدین صفحہ ۱۴ پر بزم ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے اگست سنہ ۱۹۴۶ء میں آپ کے گیتوں کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"اس ہفتے ایڈیٹر ادبی دنیا کا بھیجا ہوا ایک لفافہ پتہ لکھا ہوا واپس آیا، جس پر ڈاکئے نے پنسل سے لکھا تھا "مکتوب الیہ کا انتقال ہو گیا لہٰذا واپس ہے"، پھر جو پلٹ کر پتہ دیکھا تو لکھا تھا پنڈت اندرجیت شرما۔ بے اختیار ایک آہ سرد سینے سے نکل اور فضا میں گم ہو گئی ایک آنسو ٹپکا اور خاک میں مل گیا۔ اندرجیت شرما چل بسے اور اپنے ساتھ وہ رس وہ مٹھاس اور خوشبو بھی لے گئے جو انھوں نے اپنے سہانے گیتوں میں بسائی تھی۔ اردو کو ایسا گیت لکھنے والا مدت تک نہیں ملے گا اور ان لوگوں کو جو انھیں جانتے تھے ایسا سادہ مخلص اور گرم دل دوست قیامت تک میسر نہیں آئے گا۔ وہ ایک عرصے سے خاموش تھے لیکن یہ کسے معلوم تھا کہ یہ چپ ایک ابدی خاموشی کی پیش رو ہے اور اب ان کے نغمے اس دنیا کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس سازِ سرمدی سے ہم آہنگ ہونے والے ہیں جس کا سرود کبھی کبھی انسانی روح کی گہرائیوں میں سنا جاتا ہے۔

سُرا جی کہنے کو مر گئے لیکن جب تک ان کے گیت زندہ ہیں اور جب تک ہماری دیہاتی دوشیزائیں انھیں ندی کے کنارے جھرمٹوں میں گاتی اور شہری دُلہنیں بھی معطر تنہائیوں میں گنگناتی رہیں گی وہ خود زندہ رہیں گے، اور ہمیں زندگی سے ہمکنار کرتے رہیں گے۔"

اندرجیت شرما اُردو شاعری کی طرزِ جدید کے بانیوں میں سے تھے۔ سُرور جہان آبادی کی طرح آپ کی نظموں میں قدیم اور جدید رنگوں کا امتزاج تھا۔ سلاست زبان، چستی بندش، اور پاکیزہ تخیل آپ کے کلام کی خصوصیات ہیں۔ انداز بیان سادہ و دل کش ہونے کے علاوہ شیرینی اور اثر سے بھرپور ہے۔ ان کا کلام پڑھنے سے طبیعت کو تازگی اور نفس کو بالیدگی عطا ہوتی ہے۔

"بہارِ حسن" کی تصویر دیکھ کر ایک مسدس لکھا ہے اس کا ایک بند ملاحظہ ہو کیا خوب کہتے ہیں۔

ہائے یہ موسم گُلوں کا ہائے یہ عہدِ شباب
بے پئے رگ رگ میں ہے کیفیتِ جامِ شراب
مست ہو کر گا رہی ہیں کیا حیا کیسا حجاب
تالیاں یہ کیا ہیں بجتا ہے رنگیلی کا رباب
زندگی کا لُطف جھولے میں ہے یا گلشن میں ہے
فصلِ گل ہے ننھی ننھی بوندوں میں۔ ساون میں ہے

"مفلسوں کی ہولی" میں ہندوستانیوں کی غریبی کی کیسی دردناک تصویر کھینچی ہے۔

سب اہلِ ہند مست ہیں جامِ خیال میں
گاتے ہیں مرد و زن سبھی ہولی کا راگ آج
ہے پیٹ کو اناج نہ کپڑا بدن کو ہے
ہر شخص کھیلتا ہے لنگوٹی میں پھاگ آج

"ہندو مسلم" کی سُرخی سے ایک مسدس لکھا ہے اس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

وہ طائر ہیں کہ جن کی عمر گذری اک نشیمن میں
مکیں ہیں وہ کہ ہیں رشکِ جناں کے ایک مسکن میں
وہ گُل ہیں جن کی بو پھیلی ہوئی ہے ایک گلشن میں
وہ پُتلے ہیں نہیں کچھ فرق جن کے رنگ روغن میں
مگر افسوس ناواقف ہیں اب تک رازِ فطرت سے
اُٹھانا فائدہ سیکھا نہیں کچھ درسِ عبرت سے

"جوگن اور پپیہا" گیت ملاحظہ فرمائیے۔

"جوگن اور پپیہا"

گیت (۱)

سُن لے میرا گیت
پپیہے سُن لے میرا گیت
جوگن ہوں میں گانے والی ● پریم کا راگ سُنانے والی
پی پی کرنا پریم سے پیارے ہے یہ تیری ریت
الفت کا ہے جام پپیہے سُن لے میرا گیت
پپیہے سُن لے میرا گیت
جوگن ہوں میں گانے والی ● پریم کا راگ سُنانے والی

(۲)

میرے من کی بات
پپیہے میرے من کی بات
پی پی کا تجھ کو دُکھ بھاری ● پریم کی میرے لگی کٹاری
غم کی سر پہ چھائی گھٹا سی بیرن کالی رات
میرے من کی بات پپیہے میرے من کی بات
پپیہے میرے من کی بات
پی پی کا تجھ کو دُکھ بھاری ● پریم کی میرے لگی کٹاری

(۳)

مجھے وہی بیراگ
پپیہے مجھے وہی بیراگ
جس کے ہے تو پریم کا پیاسا ● اُسی کی ہے اس دل میں لالسا
دونوں ہی کے لگی بدن میں ہائے برہ کی آگ
تجھ کو جو احساس پپیہے مجھے وہی بیراگ
پپیہے مجھے وہی بیراگ
جس کے ہے تو پریم کا پیاسا
اُسی کی ہے اس دل میں لالسا

اندرجیت شرما نے غزلیں چکبست مرحوم کی طرح بہت کم لکھی ہیں لیکن اس صنفِ سخن میں بھی جو کچھ کہتے ہیں اُس میں بڑی جان ہوتی ہے۔ فنی حیثیت سے غزل کی قدیم روش کے پابند ہیں لیکن خیالات کے لحاظ سے ان کی غزل سوقیت و ابتذال سے پاک ہے۔ چند غزلیں ملاحظہ فرمائیے۔

ہر شے میں ترا یارب جلوہ نظر آتا ہے
جس کوہ پہ جاتا ہوں سینا نظر آتا ہے
معلوم یہ ہوتا ہے بس فرق جز و کل ہیں
قطرے کی بھی تہ میں دریا نظر آتا ہے
تو آئینۂ دل کو کر صاف کدورت سے
اس آئینہ میں اس کا جلوہ نظر آتا ہے
مجنوں کی نگاہوں سے تو دیکھ تو اے غافل
یعنی کہ ہر اک ذرہ لیلیٰ نظر آتا ہے
ہستی کے سفینے کو ساحل ہے کہاں حاصل
دریائے فنا میں یہ ڈوبا نظر آتا ہے
سینے میں تڑپتا ہے ارماں ترے ملنے کا
لیکن اسے کب کوئی رستہ نظر آتا ہے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

ہماری زبان

۸ رجون ۱۹۶۱ء

زبان اور سماج

حال میں سائمن پاٹر (Simeon Potter) کی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا موضوع ہے "جدید دنیا میں زبان"۔ اس میں ایک باب "زبان اور سماج" پر ہے جس میں بڑی پتے کی باتیں کہی گئی ہیں اس خیال سے کہ اردو دوستوں کو ان باتوں کی طرف توجہ ہو اس باب کے چند بنیادی تصورات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱) لسانیات، سماجیات اور فطری علوم دونوں کے بیچ میں آتی ہے۔ ایک طرف یہ ایک سماجی عمل ہے اور دوسری طرف ایک سائنسی تنظیم۔

(۲) زبان انسانی عمل کا ایک اہم جزو ہے جس کی تشکیل روایت اور تہذیب سے ہوتی ہے۔ سماج ایک جامد چیز نہیں ہے اس میں رشتوں اور تعلقات کا ایک پیچیدہ سلسلہ کام کرتا ہے۔ خاندان کی اس میں بڑی اہمیت ہے۔ اچھی تربیت زبان کے حاصل کرنے میں تعلیم سے زیادہ معاون ہوتی ہے گھر کی بات چیت اور زندہ دلی کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے اور ساری عمر رہتا ہے۔

(۳) ابلاغ پر گھروں اور گھر سے باہر سماج کا دارومدار ہے۔ صحیح قسم کا مباحثہ ہر آزاد سماج کے لئے ضروری ہے جلسوں میں اگر ادھر اُدھر کی باتیں ہوں اور اصل واقعہ اوجھل ہو جائے تو کبھی کوئی بات طے نہیں ہو سکتی۔ صدر کا فرض ہے کہ آزادی رائے کا احترام کرتے ہوئے لوگوں کو بہکنے نہ دے۔ اس لئے ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ کام کی بات کرے۔

(۴) ابلاغ کے دو پہلو ہیں، سننا، بات کرنے کا آدھا حصہ ہے۔ دوسرے کی بات سننا، اپنی بات کہنے کے لئے اور سوالنے کے لئے ضروری ہے۔ ہم لوگ جب بظاہر دوسرے کی بات سنتے ہیں تو دل ہی دل میں اپنی کہتے رہتے ہیں۔ پینتالیس منٹ کی تقریر کو بغیر ذہن بھٹکے ہوئے سن لینا، معمولی کام نہیں۔

(۵) ایک ترقی یافتہ سماج میں زبان کے کئی معیار ہوتے ہیں؛ خطیبانہ۔ واعظانہ۔ شاعرانہ۔ صناعانہ۔ ادبی۔ کاروباری عام بات چیت کی زبان، بامحاورہ زبان اور مخصوص حلقے کی اصطلاحی زبان زبان کی صحت اور طاقت سب سے زیادہ اس عام زبان سے متعین ہوتی ہے جو اپنے دور کی بہترین گفتگو سے برابر تازہ ہوتی رہے۔ زبان ایک جمہوری پیداوار ہے۔ یہ قواعد دانوں اور عالموں کی تخلیق نہیں، ان پڑھوں اور جاہلوں کی تخلیق ہے۔ پڑھے لکھے اور عالم زبان کے خزانے میں اضافہ کرسکتے ہیں، اس میں ادبی زبان کا حسن پیدا کرسکتے ہیں، مگر اس کی ساری بہار جنگلی پودوں کے لگائے ہوئے قطعوں کی دین ہے اور اس کی جڑیں عام زمین میں دور تک جاتی ہیں۔ اگر دنیا کی بعض معیاری زبانوں کی طرح آپ کی زبان کو مردہ نہیں ہونا ہے تو اسی جڑ سے اسے غذا حاصل کرنا چاہئے۔

(۶) اگرچہ مختلف معیاروں کی بولیوں کو ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے رہنا چاہئے مگر یہ نامناسب بات ہے کہ شاعری کی زبان اور روزمرہ بات چیت کی زبان میں بہت فرق ہو۔ آج کے ماہر لسانیات، اسی لئے کسی لفظ کو غلط یا صحیح نہیں کہیں گے۔ وہ قابل قبول اور نا قابل قبول کی اصطلاح استعمال کریں گے اور قبولیت کی کسوٹی لفظ کی صلاحیت (خیال کو ادا کرنے کی صلاحیت) ہو گی نہ کہ کسی معیار یا پیمانے سے مطابقت۔ تخلیقی فن کار کا فن اسی وقت ترقی کرسکتا ہے جب اس کے گرد ایک ہمدرد حلقہ ہو جو اس کی بات سن اور سمجھ سکے۔ فن کی تحریک اندر سے ہوتی ہے، مگر اس کی تکمیل ایک زندہ سماج کے پس منظر میں ہوتی ہے یہ شاعر اپنے دور کے سماج سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے تاثر کے نتیجہ خیز ہونے کے لئے اس تاثر کو سماج کو لوٹانا ہوتا ہے اپنے سماج کے ذریعے یہ ساری دنیا تک پہنچتا ہے۔

(۷) موثر گفتگو، تعلیم اور کوشش سے آتی ہے۔ لوگ وجدان یا جبلت سے ہی اچھی طرح بول نہیں سکتے۔ وہ زبان بولنا سیکھتے ہیں، پہلے گھریلو ماحول سے، پھر گاؤں کی سڑک یا قصبے کے محلے سے، پھر اسکول، فارم، فیکٹری، کارخانے پیشے، عبادت گاہ، کلب اور اب ریڈیو اور سینما سے بچے کی سیکھنے کی صلاحیت لامحدود ہے۔ اسی طرح ماحول میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی بھی۔

(۸) اچھی بات چیت، ایک سماجی روایت ہے۔ یہ آزادی اور ڈسپلن میں توازن قائم رکھتی ہے۔ ایک بڑا شاعر روایت کو کبھی کبھی نظر انداز کر سکتا ہے، مگر عام لکھنے والا انفرادیت اور روایت میں توازن قائم رکھنے پر مجبور ہے۔

(۹) آج جبکہ سائنسی اور صنعتی ترقی بہت تیز ہے، صحیح معلومات بہم پہنچانا پہلے سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے اس لئے انجنیر اور ڈاکٹر کو صرف اس کا فن ہی نہیں الفاظ کا صحیح استعمال بھی سکھانا چاہئے۔ سائنس کے لئے زبان کو چھٹی دینا اور بھی خطرناک ہے۔ کسی نئی مشین کا استعمال سکھانے کے لئے صرف مشین سے واقفیت کافی نہیں، زبان سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

(۱۰) اگرچہ بڑی زبانوں کے چھوٹی زبانوں کو ہڑپ کر جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے مگر، اقلیت کا اپنی زبان کو محفوظ کرنا فطری ہے۔ آخر زبان روحانی سرمایے کی ایک نشانی ہے۔

اگر کسی زبان کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے تو صرف زبان ہی کو خطرہ نہیں ہوتا۔ آزادیٔ فکر و نظر کو بھی خطرہ ہے۔ پھر زبان جبر کی ایک علامت بن جاتی ہے۔ اس لئے ریاستوں کو کسی زبان کو زبردستی نافذ کرنا یا روکنا نہیں چاہیئے۔ ہاں حکومت کے کام کے لئے وہ کسی زبان پر بھی زور دے سکتی ہیں۔

(۱۱) زبانوں کے مستقبل کی پیشین گوئی قطعیت سے نہیں کی جا سکتی بڑی زبانوں کو بھی خطرہ رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ موجودہ بڑی زبانوں کی جگہ ایک عالمی زبان لے لے۔

(۱۲) اب ساری دنیا کو تعلیم دینا لازم ہو گیا ہے۔ اس سے کم میں نجات نہیں نظر آتی مگر صرف خواندگی ہی کافی نہیں۔ لوگوں کے ذہن کی بھی تربیت کرنا ہے تاکہ وہ ایسے نعروں سے بچ سکیں جو صرف ادھر یا اُدھر لے جائیں، یا جو ہر چیز کو سیاہ یا سفید بنا کر پیش کریں ایسا ذہن جو لوگوں کو حقایق اور اُن سے اخذ کئے ہوئے نتائج میں فرق کرنا سکھائے اور ان نتائج اور ان کی اچھائی بُرائی کو مخلوط نہ کرے۔ عام تعلیم سے ہی انسان صحت مند سماج بنا سکتا ہے۔ اور قومی پاسداری اور بین الاقوامی تقاضوں میں ربط قائم کر سکتا ہے۔

ہم نے ایک آئینہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اب یہ آپ کا کام ہے کہ اس میں اپنے حسن کی بہار دیکھ کر شرمائیں یا شگفتہ ہوں۔

خواجہ دل محمد اور تمکین کاظمی کی وفات

خبر ملی ہے کہ خواجہ دل محمد صاحب کا لاہور میں انتقال ہو گیا خواجہ صاحب سے جدید نسل شاید ہی واقف ہو۔ وہ ریاضی کے اُستاد تھے، مگر ایک اچھے شاعر بھی تھے اور عرصے سے لاہور کی ادبی محفلوں کی جان۔ ادھر برسوں سے گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب بہت سادہ اور عام فہم اسلوب میں نظمیں لکھتے تھے۔ جن لوگوں نے ۱۹۳۵ء کی علی گڑھ کی جوبلی میں اُن کا کلام سُنا تھا وہ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ افسوس ہے کہ آپ کے انتقال سے پُرانی نسل کی ایک اور قابل قدر ہستی ہم سے جُدا ہو گئی۔

تمکین کاظمی داغ کے شاگرد تجلی کے بیٹے تھے اور شروع سے اُنھیں شعر و ادب سے گہرا شغف تھا۔ اُنھوں نے بزم داغ کے نام سے حال میں داغ کی بڑی متوازن سوانح عمری لکھی تھی رنگین و انشا کی ریختی کا جو مجموعہ نظامی پریس سے شائع ہوا تھا اُس پر اُن کا طویل مقدمہ اُن کی تحقیق و تدقیق کا بڑا اچھا آئینہ تھا۔ دو تین سال ہوئے کاظمی صاحب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے اور باوجود خرابیٔ صحت اور مالی مشکلات کے ادبی کاموں میں ہمہ تن مصروف تھے۔ حکومت ہند نے اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر اُنھیں سَو روپیہ ماہوار کا وظیفہ بھی دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی، ورنہ وہ اُردو ادب کی اور خدمت کرتے۔

اِدھر اُدھر سے

رباعیات عمر خیام کا قلمی نسخہ

لندن۔ ۱۹ر مئی۔ آج کل برطانیہ میں عمر خیام کی رباعیات کے ترجمے کا ایک نسخہ فروخت ہو رہا ہے جس کا ترجمہ میجر جان بودن نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ عمر خیام کی رباعیات کے ایک نئے قلمی نسخے سے کیا گیا ہے جس کا علم عمر خیام کے انیسویں صدی کے مترجم فٹز جیرالڈ کو نہیں تھا۔

یہ قلمی نسخہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے۔

ہندی، اُردو اور سنسکرت کتابوں پر انعامات

لکھنؤ۔ ۲۹ر مئی۔ حکومت اتر پردیش نے ہندی کتابوں پر انعامات تقسیم کرنے سے متعلق اسکیم کو نئی شکل دی ہے جس کے مطابق اب انعامات دو درجوں میں تقسیم کئے جائیں گے۔

پہلے درجہ میں چھ قسم کی اور دوسرے درجہ میں پانچ قسم کی کتابیں ہوں گی۔ یہ انعامات ہندوستان کے مشہور ادیب سائنسداں سیاستداں فلاسفر وغیرہ کے نام پر رکھے گئے ہیں۔

درجہ اول۔ رابندر انعام (ہندی ادب) موتی لال نہرو انعام (قانون)، بیربل ساہنی انعام (سائنس)، ڈاکٹر بھگوان داس انعام (فلسفہ) مدن موہن مالویہ انعام (تعلیم) اور پنت انعام (سیاست یا معاشیات)۔

درجہ دوم۔ پریم چند انعام (افسانہ نگاری) بال کرشن شرما نوین انعام (شاعری) پرساد انعام (ڈرامہ) نریندر دیو انعام (تاریخ) اور بھال (ڈاکٹر کے این بھال) انعام سائنس۔

درجہ اول کے انعامات میں ہر انعام ۵۰۰۰ روپیہ اور درجہ دوم میں ہر انعام ۲۵۰۰ روپیہ کا ہوگا۔ اس کے علاوہ پانچ پانچ سو روپیہ کے ۳۰ انعامات مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں پر دیے جائیں گے۔

اُردو کے مشہور و معروف ادیبوں کو بھی انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔ یہ انعامات غالب انعام۔ رام پرشاد۔ بسمل انعام اور اکبر الہ آبادی انعام کے نام سے موسوم کئے جائیں گے۔ غالب انعام ۱۵۰۰ روپیہ۔ رام پرشاد بسمل انعام اور اکبر الہ آبادی انعام بالترتیب ۱۲۰۰ روپیہ اور ۸۰۰ روپیہ کے ہوں گے اس کے علاوہ پانچ پانچ سو روپیہ کے دس انعامات اور ہوں گے جو مختلف موضوعات پر لکھی گئی اُردو کتابوں پر دئے جائیں گے۔

سنسکرت کتابوں سے متعلق کالی داس انعام اور گنگا ناتھ جھا انعام بالترتیب ۱۵۰۰ روپیہ اور ایک ہزار روپیہ کے ہوں گے۔ کالی داس انعام سنسکرت ادب پر اور گنگا ناتھ جھا انعام دوسرے موضوعات پر دیا جائے گا۔ مزید برآں پانچ پانچ سو روپیہ کے تین اور انعامات دوسرے موضوعات پر لکھی گئی سنسکرت کتابوں پر دئے جائیں گے۔

غزل

ناطق گلاؤٹھوی

خود ہو کے کچھ خدا سے بھی مرد خدا نہ مانگ
رسم دعا یہ ہے کہ دعا لے دعا نہ مانگ

نادان ماسوا سے نہ کر التجا نہ مانگ
مانگے خدا سے بھی تو خدا کے سوا نہ مانگ

میں اپنی بے زری کی ندامت کو کیا کہوں
تو اور شرمسار نہ کر اے گدا نہ مانگ

ان کا کرم بھی دیکھ لے اپنا بھرم بھی رکھ
پردے ہی سے مانگ مگر مدعا نہ مانگ

اس خاکدان دہر میں گھٹتا اگر ہے دم
مقدور ہو تو آگ لگا دے ہوا نہ مانگ

خوگر ہو درد کا کہ یہی ہے علاج درد
یہ کس کے بس کا روگ ہے اس کی دوا نہ مانگ

رکھتا ہے کون جود و عطا کا ترے شمار
میرا حساب یہ ہے کہ دے لے خدا نہ مانگ

رسم طلب میں کیا ہے سمجھ کر اٹھا قدم
آ تجھ کو ہم بتائیں کہ کیا مانگ کیا نہ مانگ

رکھی ہوئی ہے ساری خدائی ترے لئے
[illegible] دامن کے سامنے آ مانگ یا نہ مانگ

کیسا ترا خیال ہے دیتا ہے کس کو کون
در در اس اپنے وہم کی سائل ہوا نہ مانگ

گھر کا سکون ڈھونڈ نہ باہر کی چھاؤں لے
ہمسایہ مانگ سایۂ بال ہما نہ مانگ

قسمت میں جو لکھا ہے پہنچ جائے گا ضرور
کر اس میں جستجو کہ نہ کر مانگ یا نہ مانگ

نعمت وہی ہے جس میں طلب کا نہ ہو سوال
جو تجھ کو مانگنے سے ملے وہ نہ کھا نہ مانگ

ناطق اگر دعا کو اجابت نہیں نصیب
میری صلاح یہ ہے کہ تو روٹھ جا نہ مانگ

غزل

صبا جائسی

زخم دل سے سیکھو تو کچھ فریب کھانا بھی
زیب دیگا تب غنچہ ہم کو مسکرانا بھی

بات بات پہ آنسو کیوں نکلتے رہتے ہیں
دل کو خوں ہوئے گزرا اب تو اک زمانہ بھی

خوش ہیں دشت غربت میں بیٹھنے کا شوق ہے
ہو گیا مگر کب کا کارواں روانہ بھی

ہم تو خیر کیا بدلے بزم دہر بدلی ہے
چھپ کے گھڑی ہے محفل میں عشرت شبانہ بھی

ان کے غم کا سرمایہ بے بہا سہی لیکن
زندگی کی راہوں میں کچھ تو تھا اثاثہ بھی

انتہائے الفت ہے یا تو انتقام ہے
ہم کو آ گیا کیسے تجھ سے روٹھ جانا بھی

زخم دل صبا میرے خندہ زن تھے کچھ ایسے
چھپ سکے نہ مدتوں رو دی گردش زمانہ بھی

غزل

حبیب احمد صدیقی

بہار کی نہ سہی کچھ خزاں کی بات کرو
بہار کوئی بھی ہو گلستاں کی بات کرو

ستمگری میں فلک ہی کا نام کیوں آئے
کسی شفیق کسی مہرباں کی بات کرو

حکایت غم دوراں سناؤ اوروں کو
کرو جو ہم سے تو عزم جواں کی بات کرو

بہت سنا چکے احوال دست برد خزاں
بہار و گلشن و آب رواں کی بات کرو

ستم کشوں کو سناؤ نوید عشرت امن
ستم شعاروں سے تیغ و سناں کی بات کرو

ہو ابتدا ہی میں کیا فکر دوری منزل
ابھی تو بس جرس و کارواں کی بات کرو

سنی حکایت جنگ و جدال دہر بہت
کرو جو اب تو مہ و کہکشاں کی بات کرو

دوام ہوش کی تلقین دوام عقل کی بات
کبھی تو بادہ و رطل گراں کی بات کرو

تمام عمر جہاں زندگی گنوائی ہے
اسی دیار اسی آستاں کی بات کرو

بس اب تمام کرو داستان خود نگری
خیال خاطر آزردگاں کی بات کرو

نگاہ ناز سے ملتے ہی کہہ دیا سب کچھ
نگاہ شوق کے حسن بیاں کی بات کرو

ہے یوں تو ذکر بہاراں بھی دلپذیر بہت
قفس نصیب سے کچھ آشیاں کی بات کرو

غزل

ارشد صدیقی

کتنے ساقی مے گلفام لئے پھرتے ہیں
اور ہم ہیں کہ یہی جام لئے پھرتے ہیں

عمر گزری کہ تبسم کی لکیروں میں چھپائے
تلخی گردش ایام لئے پھرتے ہیں

نکہتیں ہیں یہ چمن میں کہ لبوں پر ہم کیوں
نکہت عارض گلفام لئے پھرتے ہیں

شرم اے حسن جفا پیشہ کہ کوچے میں ترے
آج تک ہم دل ناکام لئے پھرتے ہیں

جانے کیا دیکھا ہے اس شوخ نگاہوں کی ہم
اپنے سر عفت کا الزام لئے پھرتے ہیں

جب سے ہم نے ترے کوچے سے گزرنا چھوڑا
نامہ بر شہر میں پیغام لئے پھرتے ہیں

کیا کریں گے وہ مری راتوں کو روشن ارشد
رخ پہ جو زلف سیہ فام لئے پھرتے ہیں

غزل

وحیدہ نسیم

نہ بہار کی شکایت نہ گلہ ہے باغباں سے
یہ چمن کو کیا ہوا ہے کہ ہیں مطمئن خزاں سے

یہ قدم قدم پہ بندش یہ روش روش پہ پہرے
کہ نہ رو سکے لپٹ کر کوئی خاک آشیاں سے

یہ ہماری خستہ پائی کہ رواں دواں ہیں لیکن
نہ تو کارواں میں شامل نہ جدا ہیں کارواں سے

نئے رنگ بھر دئے ہیں وہی ربط آرزو نے
مری داستاں کے ٹکڑے نہ ملے جہاں جہاں سے

وہی بدنصیب ذرے ہیں غبار اب زمیں کا
کبھی ٹوٹ کر گرے تھے جو فلک کی کہکشاں سے

یہ وہ قافلے ہیں ہمدم کہ نہ پوچھ جن کی منزل
نہ بتا سکیں گے یہ بھی کہ چلے تھے یہ کہاں سے

وہی درد زندگی ہے وہی کرب بندگی ہے
وہی حرف آرزو جو نہ نکل سکا زباں سے

یہی نظم گلستاں ہے تو نسیم کیا کریگی
وہ بہار میں لٹیں گے جو بچے رہے خزاں سے

مراسلات

مثنوی مولانا روم کے قدیم قلمی نسخے

"ہماری زبان" مورخہ ۸ مئی ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے راقم کی بعض ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے خیال میں میرے اس مراسلے (ہماری زبان ۲۲ اپریل ۱۹۶۱ء) میں راہ پا گئی ہیں جو میں نے ان کے مراسلے (ہماری زبان ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء) سے متعلق تحریر کیا تھا۔ میں نے "ہماری زبان" کے قارئین کی اطلاع کے لئے ترکی کے ان کتب خانوں کا ذکر کیا تھا جہاں آج کل مثنوی مولانا روم کے قدیم قلمی نسخے موجود ہیں۔ میرا مقصد نہ تو ڈاکٹر صاحب پر "بددیانتی" کا الزام لگانا تھا اور نہ ہی ان کی "معلومات کی بنیاد" دریافت کرنا تھا۔

اس سلسلے میں میں "خود کسی غلط فہمی کا شکار" نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مراسلے (ہماری زبان ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء) میں اس بات کا اشارہ تک نہیں کیا تھا کہ انھوں نے قونیہ کے میوزیم کے نام کا ترجمہ کر دیا ہے۔ میں نے "خواہ مخواہ" اس کو اسم علم نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے اسی مراسلے میں "برٹش میوزیم" "انڈیا آفس" اور "کتاب خانۂ ظہیر آفندی" وغیرہ لکھا تھا چنانچہ میں "موزۂ آثار قدیمہ" کو بھی اسم نکرہ نہ سمجھنے میں حق بجانب تھا۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب کے مراسلے (ہماری زبان ۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء) سے یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کی معلومات کی بنیاد نکلسن کی مولانا روم کی مثنوی جلد سوم کا انگریزی مقدمہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میوزیم سے متعلق نسخے کا سن کتابت، کاتب کا نام اور ترقیمہ کی عبارت اس انداز سے پیش کی گئی تھی کہ اگر قاری یہ سمجھے کہ مراسلہ نگار نے خود اس نسخہ کو دیکھا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

میں نے نکلسن کی مولانا روم کی مثنوی جلد سوم کے انگریزی مقدمہ کو بھی دیکھا اور بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس میوزیم کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے پہلے مراسلے (۲۲ مارچ ۱۹۶۱ء) میں "موزہ آثار قدیمہ" اور دوسرے مراسلے (۸ مئی ۱۹۶۱ء) میں "قونیہ ارکیالوجیکل میوزیم" تحریر فرمایا ہے، اس کا اصلی نام خود نکلسن نے اپنے اسی مقدمے میں صفحہ ۱۰ پر "آثار عتیقہ موزہ سی" لکھا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ اس نام کا ایک میوزیم سنہ ۱۹۱۲ء میں قونیہ میں قائم کیا گیا تھا لیکن وہ مصطفےٰ کمال اتاترک کی انقلاب پسندیوں کے نذر ہو گیا۔ اور اس نام کا کوئی میوزیم اب ترکی میں موجود نہیں ہے۔ اس کے وہ بچے کھچے نوادرات جو حضرت مولانا روم سے متعلق تھے "مولانا موزہ سی" میں رکھ دیے گئے ہیں۔ چنانچہ اب مثنوی مولانا روم کا وہ نسخہ بھی "مولانا موزہ سی" ہی میں ہے جس کا ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے سب سے پہلے ذکر کیا ہے اور جس کی بابت ریٹر نے نکلسن کو لکھا تھا کہ قونیہ کے "آثار عتیقہ موزہ سی" میں ہے۔ اس سلسلے میں "ریٹر یا نکلسن سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی" یہ نسخہ سنہ ۱۹۲۶ء میں "آثار عتیقہ موزہ سی" میں ضرور رہا ہوگا لیکن ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے سنہ ۱۹۶۱ء میں یہ لکھ کر کہ یہ نسخہ "موزۂ آثار قدیمہ" یا "ارکیالوجیکل میوزیم" میں محفوظ ہے، ایسی غلطی کی ہے جس کی ذمہ داری سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

استانبول کے "کتاب خانۂ ظہیر آفندی" کے متعلق یہ عرض ہے کہ میں نے اس کے "وجود" سے ہرگز انکار نہیں کیا۔ میں نے صرف یہ لکھا تھا کہ "قسطنطنیہ یعنی استانبول میں اس نام کا کوئی کتب خانہ موجود نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اس کتب خانے کا وجود رہا ہو۔ لیکن اب اس کا بھی علم نہیں ہے کہ اس کی کتابیں کہاں ہیں۔" میرا مقصد یہ تھا کہ اس وقت استانبول میں اس نام کا کوئی کتب خانہ موجود نہیں ہے۔ میرے اس بیان کی تردید نہ تو نکلسن کے مقدمے سے ہو سکتی ہے اور نہ یہ کہنے سے کہ "یہ شخصی کتاب خانہ ہونے کی وجہ سے میرے علم میں نہ آ سکا۔" مکرر عرض ہے کہ اس نام کا کوئی شخصی یا عمومی کتب خانہ آج کل استانبول میں موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس وقت اس کا علم ہے کہ آجکل اس کی کتابیں کہاں ہیں۔ اس کتب خانے کی اطلاع ریٹر نے سنہ ۱۹۲۶ء میں نکلسن کو دی تھی جس کے نہ تو یہ معنی ہیں کہ آج سنہ ۱۹۶۱ء میں بھی یہ کتب خانہ موجود ہے اور نہ محترم ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ریٹر یا نکلسن کا قول نقل کر کے اس ذمہ داری سے بری ہو سکتے ہیں جو ان کے پہلے مراسلے کے ذریعہ ایک ایسے کتب خانے کے غائب وجود کا اثبات کرنے کی صورت میں ان پر عاید ہو چکی ہے جو اب ناپید ہو چکا ہے، اور جس سے نہ جاننے والے غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اطلاعاً عرض ہے کہ ریٹر ہی کے ایک ترک شاگرد اور میرے استاد پروفیسر احمد آتش آج کل اس کتب خانے کے مخطوطات کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن ابھی تک ان کو کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

نافذ پاشا کے کتب خانے کے بارے میں میرا مدعا صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا۔ یہ کتب خانہ بھی کبھی تھا لیکن آج اس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کی کچھ کتابیں "سلیمانیہ عمومی کتب خانہ سی" میں البتہ موجود ہیں۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں کہ سلیمانیہ میں نافذ پاشا کے کتب خانے کا مذکورہ نسخہ ہے یا نہیں۔

پچھلے مراسلے میں میں نے صرف کتب خانے کے بارے میں اطلاع دی تھی نہ کہ مذکورہ نسخہ کے موجود ہونے نہ ہونے کے بارے میں۔ پتہ نہیں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے یہ کیسے لکھ دیا کہ "تیسرا نسخہ نافذ پاشا کے کتاب خانے میں ہے۔"

ڈاکٹر صاحب اس نام کے کتاب خانے سے واقف ہیں، اس بنا پر اس سے انکار نہیں ہے۔ البتہ نسخۂ مذکور ان کی نظر سے نہیں گزرا اس لئے میرے بیان پر ان کا اعتقاد مشکوکانہ ہے۔"

مندرجہ بالا کی تصدیق ان کتابوں سے کی جا سکتی ہے:-

۱۔ راقم ضیا اراد غلو؛ استانبول (استانبول سنہ ۱۹۵۰ء)
۲۔ استانبول عمومی کتب خانہ لری (استانبول سنہ ۱۹۵۱ء)
۳۔ محمد اوندر: قونیہ (قونیہ سنہ ۱۹۵۲ء)
۴۔ ترکیہ کتب خانہ لری (انقرہ سنہ ۱۹۵۰ء)
۵۔ محمد اوندر: مولانا موزہ سی (قونیہ سنہ ۱۹۵۶ء)
۶۔ اسلام انسکلو پیدیسی۔ جلد ۵۔ ص ۴۸۵
(اکمل ایوبی۔ ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)

عمر خیام اور سبع سیارہ

شاطر اکل کنوی کا مراسلہ "عمر خیام شاعر نہیں تھا؟" (جو انھوں نے غالباً قلم برداشتہ لکھا ہے) مطالعہ گرامی سے گزرا ہی ہوگا۔ خدا معلوم خود کیا سمجھے ہیں اور دوسروں کو کیا سمجھایا ہے؟ مثلاً

۱۔ "ایک حد تک حضرت ناطق کا دعوٰی صحیح ہو سکتا ہے..." اور "جناب ناطق کا یہ دعوٰی اس وقت صحیح ہو سکتا ہے....." آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟

۲۔ اگر واقعی عمر خیام ایک بہت بڑا عالم معقولات تھا تو پھر ہمیں اسے عالم دین کہنا چاہیئے" یہ کونسی منطق ہے؟ اور کیا "عمر خیام کے بہت بڑا عالم معقولات" ہونے میں شک ہے؟

۳۔ "ناطق صاحب سے ہماری درخواست ہے کہ ظاہری چیز کو باطن میں کبھی تبدیل نہ کریں اسلام ظاہر کو دیکھتا ہے نہ کہ باطن" یہ علمی بحث ہے یا مذہبی وعظ؟

آپ کو یہ بھی یاد دلادوں کہ ۱۵ر مارچ کا مراسلہ جس پر انھوں نے تعقبات فرمائے ہیں اس عاجز کا تھا مگر مراسلہ نگار کے ہوش و حواس کا یہ عالم ہے کہ وہ اسے ناطق صاحب کا سمجھ بیٹھے۔ اور پھر جو جی چاہا تہمت فرما دیا۔

اور اس کی خاطر رد ہوا تو اس عاجز مینوا کا مصرعہ

کرم کردی الٰہی زندہ باشی

حالانکہ ہزار کام چھوڑ کر میں نے "سبع سیارہ" تلاش کرائی اور پھر ناطق صاحب کے جملہ دلائل پر تبصرہ کیا اور اسکی خاطر "خیامیات" پر عربی فارسی اُردو اور انگریزی میں قدیم اور جدید جتنا لٹریچر تھا اُسے کھنگالا۔

بہر حال اصل بحث اب شروع ہوئی ہے اور "سبع سیارہ" کے

زیر عنوان ناطق گلاؤ ٹھوی کا یہ مطالبہ:-

"عمر خیام کی رباعیات کے سلسلے میں ضیا احمد صاحب کو بھی اعتراف ہے...............خود عمر خیام کی نہیں ہیں۔"

"خیامیات" کی ایک نہایت اہم بحث کا افتتاح ہے اور اب جب کہ آپ نے اس مطالبہ کو "ہماری زبان" میں شائع کر دیا ہے تو ابھی اس بحث پر "زبان بندی" عائد نہ فرمائیں۔

(شبیر احمد غوری)

اُردو اداروں کی انگلش پسندی

اُردو اداروں کی انگلش پسندی کا یہ حال ہے کہ پورا خط تو لکھا اُردو میں اور دستخط انگریزی میں! کیا اُردو میں دستخط کرنے کا رواج نہیں ہے؟ یا انگریزی میں دستخط کرنا کوئی موجب عزت بات؟ یہ انگریزی دستخط صرف اُردو خطوں ہی میں نہیں پائے جاتے ہیں بلکہ اُردو رسالوں میں نکلنے والی تصویروں اور کارٹونوں پر بھی دستخط انگریزی میں ہوتے ہیں۔ جب پرچہ اُردو میں نکل رہا ہے؟ جب اُردو سے نفع حاصل کیا جا رہا ہے؟ جب اُردو زبان کو ذریعہ تبلیغ بنایا جا رہا ہے، تو پھر یہ اُردو دشمنی کیوں؟ اگر یہ عذر لنگ پیش کیا جائے کہ کارٹونسٹ اُردو نہیں جانتا ہے تو پھر ایسے لوگوں کو اُردو اداروں میں جگہ ہی کیوں ملے جو اُردو نہیں جانتے ہیں! میں ہفتہ وار "ہما" دہلی کو مبارک باد دوں گا کہ ان کی تصویروں اور کارٹونوں میں اُردو دستخط نظر آتے ہیں۔ اب ذرا کچھ نمونے ملاحظہ فرمایئے:-

ہمدرد دواخانہ | ہمدرد صحت سے متعلق خطوں میں دستخط، حوالہ نمبر اور تاریخ انگریزی میں۔ ایک جلد:..... آئندہ مدت کا زر چندہ Rs. 4/-...

ادارہ طلبہ دہلی | اُردو خطوں میں دستخط، حوالہ نمبر اور تاریخ انگریزی میں۔

دستاویز دہلی | تاریخ، حوالہ، دستخط انگریزی میں۔

انقلاب بمبئی | دستخط اور تاریخ انگریزی میں۔

بزم آفس بمبئی | دستخط وغیرہ انگریزی میں۔

مکتبہ جامعہ دہلی | تمام انگریزی میں۔

انجمن ترقی اُردو | باتیں تو ہیں ہی ساتھ ساتھ یہ بھی کہ رقم وصولی رسید انگریزی میں اور اس پر دستخط بھی انگریزی میں۔

ادارہ ادبیات اُردو | سنی اُردو صولتے وقت تہنیت النساء بیگم صاحبہ کا دستخط انگریزی میں۔

(اقبال کرشن)

یہ شعر کس کا ہے؟

بہت دنوں سے اس تجسس میں ہوں کہ یہ شعر جو نہ معلوم کب سے مجھے یاد ہے اور تقریباً ہندو پاک کے ہر اُردو پڑھے لکھے شخص کی زبان پر ہے۔ کس کا ہے؟

براہ کرم ناظرین "ہماری زبان" سے معلومات فراہم کر کے ہماری زبان ہی کے ذریعہ مطلع فرمایئے۔ شعر یہ ہے:-

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے ● جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

میرا خیال تھا کہ یہ شعر داغ مرحوم کا ہے مگر مرحوم کے کسی مجموعہ میں بھی نظر سے نہیں گزرا۔

(عطاء اللہ، جے پور)

براہ کرم توجہ فرمایئے!
اگر آپ چاہتے ہیں کہ اُردو کی ترقی اور شان بچی رہے تو براہ کرم
کی حفاظت کیجئے کہ دور دراز علاقوں تک بھی اس کی رسائی ہو
خریداری قبول کیجئے اور اپنے دوستوں کو "ہماری زبان"
کی سالانہ قیمت صرف ... روپیہ بھی ادا کر دیں
بھیجئے تاکہ یہ سلسلہ جاری رہے۔
منیجر

انجمن کا خبر نامہ

اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا سرکاری اعلان کیا جائے

انجمن ترقی اردو کے وفد کی چیف منسٹر مسٹر ڈی سنجیویا سے نمایندگی، اہم قوانین، قواعد اور اعلانات اردو میں شائع کئے جائیں، یادداشت کی پیشکشی

حیدرآباد۔ ۱۷ر مئی۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے ایک وفد نے چیف منسٹر مسٹر ڈی سنجیویا سے ملاقات کرکے درخواست کی کہ اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان قرار دیے جانے کا سرکاری اعلان کیا جائے۔ وفد میں مسٹر حبیب الرحمٰن معتمد انجمن، پروفیسر ہارون خاں شروانی رکن کونسل، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ایم۔پی، مسٹر دیولا پلی راما نج راو ایم۔پی، رائے جانکی پرشاد...... رکن کونسل اور مسٹر عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست شامل تھے۔ وفد نے چیف منسٹر کو ایک یادداشت پیش کی جس میں بتایا گیا ہے کہ اردو کی برقراری کے لئے اتنی کوشش نہیں کی جا رہی ہے جتنی کہ ضرورت ہے۔ اردو کے متعلق حکومت کے تیقنات کا ذکر کرتے ہوئے یادداشت میں کہا گیا ہے کہ اہم قوانین، قواعد اور اعلانات ان علاقوں کے لئے اردو میں شائع کئے جائیں جہاں آبادی کا کم از کم ۱۰ فی صد حصہ اردو مادری زبان رکھتا ہے۔ آندھرا پردیش سکریٹریٹ سروس اور منسٹریل سروس میں راست تقررات کے لئے حکومت کے ۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ء کو جاری کردہ صحافتی اعلانیہ کے مطابق اردو کو بدستور ایک علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔

ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والی آبادی کم از کم ۱۰ فی صد ہو، ضلع پریشدوں، پنچایت سمیتوں کو اور دوسری مجالس مقامی کو ہدایت کی جائے کہ اپنے جلسے کی روئیداد تلگو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ریکارڈ کی جائے۔ اس طرح ان علاقوں میں متعلقہ ضلع کے دفاتر میں اردو داں طبقہ کو پوری سہولتیں دی جائیں۔

یادداشت میں جو دوسرے امور پیش کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں ایسی گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ خدمات کے لئے جن پر تقررات میں زبان دوم کا امتحان لازمی ہے، اردو کو ایک زبان دوم کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ ایسے علاقوں میں جہاں کی آبادی کا کم از کم دس فی صد حصہ اردو مادری زبان رکھتا ہے۔ تحتانی اور ثانوی مدارس میں اگر دس طلبہ ہوں تو انکی مادری زبان میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

یادداشت میں بتایا گیا ہے کہ ریاست کی اردو بولنے والی آبادی کو بھی اسی طرح مکمل زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے جس طرح کہ کسی دوسری زبان بولنے والوں کو ہے۔ ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ کی جائے۔ خاص طور پر جبکہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس کا بارہا اعلان کر چکی ہیں۔

کمشنر لسانی اقلیت سے انجمن ترقی اردو کے وفد کی نمائندگی

حیدرآباد۔ ۱۹ر مئی۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے ایک وفد نے ایک وی گیسٹ ہاؤز میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر مسٹر بی این ملک سے ملاقات کی اور انھیں ایک یادداشت پیش کی جو ۱۷ر مئی کو چیف منسٹر آندھرا پردیش کو پیش کی جا چکی ہے۔ وفد مسٹر حبیب الرحمٰن، پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم ایل سی، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ایم پی، عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست اور رائے جانکی پرشاد پر مشتمل تھا۔ وفد نے تفصیل کے ساتھ مسٹر ملک کو ریاست کے اردو بولنے والوں کے مطالبات نظم و نسق میں اردو کے استعمال سے متعلق مسائل اور اردو بولنے والوں کے حقوق اور دیگر مسائل سے واقف کرایا۔ وفد نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ساؤتھ زون کونسل کے اجلاس میں جو ۲۲ر مئی کو بنگلور میں منعقد ہو رہا ہے ان مطالبات اور مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا جانا چاہئے۔ لسانی اقلیتوں کے کمشنر نے وفد کی نمائندگی انتہائی دلچسپی کے ساتھ سنی اور اپنی طرف سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یقین دلایا کہ وہ ان مسائل کو زونل کونسل سے رجوع کریں گے۔ اس بات چیت کے موقع پر مسز بھارت چندر کھنہ اور وینکٹ راؤ ڈپٹی سکریٹری اور اسسٹنٹ سکریٹری جنرل ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ نے ریاستی حکومت کی نمائندگی کی۔

ریاست مدراس کی فراخ دلی

مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ گزشتہ ماہ مدراس اسمبلی نے یہ طے کیا کہ جس علاقہ میں مردم شماری کے اعداد یہ بتلائیں کہ وہاں کی مادری زبان کون سی ہے اور اکثریت جس علاقہ میں جس زبان کی ہو گی اسے اس علاقہ کی سرکاری زبان مان لیا جائے۔ اس فیصلہ کے مطابق جب مردم شماری کے اعداد شائع ہوئے تو "اردو" ویلور، آمبور، وانمباڑی، پرنامبٹ، گڈیاتم اور ترپاتور کے تعلقوں کی مادری زبان تسلیم کر لی گئی۔ اور وہاں کے پنچایتوں، میونسپلٹیوں کے احکامات تامل کے ساتھ اردو میں بھی نکلا کریں گے۔ اور اردو عرضیوں کو قبول کرکے جوابات بھی دیے جائیں گے۔

حکومت مدراس کی اس فراخ دلی اور ریاست کے وزیر تعلیم شری۔ سی سبرامنیم کی اس وسیع القلبی اور وسیع النظری کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ (ابوالخیر۔ پیارم پیٹ)

اردو جماعتوں کے لئے گراں قدر عطیہ

شاہ پور کے ہندو اور مسلمان معززین نے ۱۸ر مئی ۱۹۷۶ء کو قیام جماعت ہشتم اردو کے سلسلے میں مالی امداد کے لئے شاہ پور کے سیٹھ سولانی صاحب سے ملاقات کی۔ سیٹھ سولانی صاحب نے وفد سے اظہار ہمدردی فرماتے ہوئے تین ہزار تین سو (۳۳۰۰) روپیہ بطور عطیہ قیام جماعت ہشتم (ہندوستانی) دینے کا اعلان کیا۔ جس کیلئے شاہ پور کے شہری ان کے مشکور ہیں۔

(سردار کرہ ہوار دکن انجمن ترقی اردو شاخ شاہ پور)

بیسک اسکولوں میں اُردو تعلیم انجمن ترقی اُردو لکھنؤ کا جلسہ بیسک اسکولوں میں اُردو تعلیم کے جائزے کے سلسلے میں زیر صدارت سید علی عباس حسینی ممتاز ہائر سکنڈری اسکول ہوا۔ جلسہ میں انجمن کے اراکین کے علاوہ دوسری ادبی انجمنوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ جنرل سکریٹری ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے تعلیمی جائزہ سے متعلق تمام اسکولوں کی رپورٹ پڑھ کر سنائی اور اس بات پر افسوس کیا کہ ابھی تک انجمن کے ذمہ دار اور ممبران حضرات نے اپنے اپنے حلقوں اور کاموں کی کوئی رپورٹ نہیں دی اس سے کارپوریشن کے پورے اسکولوں کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔ جلسہ میں حسب ذیل تجاویز پاس ہوئیں :-

۱۔ یہ جلسہ خلیق الزماں متعلم ممتاز ہائر سکنڈری اسکول کی پُرخلوص محنت کا شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے کارپوریشن کے بیسک اسکولوں میں اُردو کی تعلیم کا جائزہ لیا۔

۲۔ یہ جلسہ انجمن کے ممبران اور ذمہ داران حضرات کی توجہ تعلیمی جائزے کی طرف مبذول کرتا ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے متعلقہ حلقوں کی رپورٹ روانہ کریں۔

۳۔ یہ جلسہ اس امر پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ کارپوریشن کے تحت چلنے والے بیسک اسکولوں میں مادری زبان اُردو کے طلبہ کی کافی تعداد ہونے کے باوجود، ذریعہ تعلیم اُردو نہیں بلکہ ہندی ہے۔ اس لئے یہ جلسہ کارپوریشن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ حکومت ہند اور حکومت صوبہ کے احکام کے مطابق عمل کرے اور اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اُردو کرنے کا انتظام کرے نیز اُردو پڑھانے والے اساتذہ کو مقرر کرے۔

کامٹی میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ ۱۸ر مئی سنہ ۱۹۶۱ء کو فیض انصاری کی کوششوں سے محبان اُردو کامٹی کا ایک جلسہ پبلک لائبریری گجری بازار کامٹی میں زیر صدارت جناب گوروداس رام سوز ہوشیارپوری ۹ بجے شب منعقد ہوا۔ جلسہ میں محبان اُردو خاصی تعداد میں شریک ہوئے۔ جلسہ کی پہلی تجویز کے مطابق ایک اڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کو اختیار دیا گیا کہ وہ انجمن کی رسیدیں چھپوائے اور ۱۵ر جون تک ممبرسازی کا کام ختم کرکے ۱۹ر جون کو مستقل انجمن کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لائے۔ دوسری تجویز کے ذریعہ حاضرین جلسہ سے درخواست کی گئی کہ انجمن کی فوری ضرورت کیلئے چندہ دیں۔ چنانچہ اس تجویز پر اُسی وقت ساڑھے چودہ روپے نقد جمع ہوگئے۔

اڈہاک کمیٹی کے عہدے دار :-

صدر : جناب پنڈت گوروداس رام سوز ہوشیارپوری۔

سکریٹری : نظیر رشیدی۔

مجلس عاملہ : ظہیر الحسن۔ حمید جمال۔ مختار کلیم۔ حلیم ثانی۔ محمد طیب۔ سعید اختر۔ صدیق اختر انصاری۔

(نظیر رشیدی، سکریٹری اڈہاک کمیٹی)

یوم محمود گاواں محمد آباد بیدر۔ ۳ تا ۴ر جون ۶۱ء یوم خواجہ جہاں محمود گاواں منایا جارہا ہے۔ ۳ر جون کو ۵ بجے مزار خواجہ محمود گاواں پر چادر گل چڑھائی جائے گی اور چراغاں ہوگا۔

ایک علمی اجلاس ہوگا جس میں محمود گاواں اور بہمنی سلطنت پر مقالے پڑھے جائیں گے۔ ایک نمائش منعقد کی جائے گی جس میں بہمنی دور سے متعلق قلمی تصاویر اور نادر کتابیں، شجرے، اسناد، سکے اور فرامین وغیرہ رکھے جائیں گے۔　　(محمد عمر یوسفی)

یوم حسرت ۲۲ر مئی کو قاضی شریف الدین کے دولت کدہ پر انجمن ترقی اُردو شاخ بریلی اور بزم محبت کا مشترکہ جلسہ یوم حسرت منانے کے لئے منعقد ہوا۔ جناب چودھری اشتیاق احمد نے جلسے کی صدارت کی۔ صدارتی تقریر کے بعد پروفیسر عبدالشکور نے اپنی تقریر میں حسرت مرحوم کی لائف اور کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا کے تبحر علمی کا ذکر کیا اور ان کی غزلوں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ ان کی تقریر کے بعد سردار احمد خاں نے حسرت کے سیاسی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا کے کلام کے چند نمونے پیش کئے۔ صدر کی تقریر کے بعد جلسہ خیر وخوبی کے ساتھ ختم ہوا۔

(انور علی۔ جنرل سکریٹری)

یوم ٹیگور ۲۰ر مئی کی شام شوکت لٹریری ایسوسی ایشن (رجسٹرڈ) کرنول کے زیر اہتمام رابندر ناتھ ٹیگور کی صد سالہ سالگرہ، گورنمنٹ مسلم ہائی اسکول کے احاطہ میں منائی گئی جناب جی۔ گروداس صاحب، جوائنٹ کلکٹر کرنول نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ اُردو، تلگو اور انگریزی میں مختلف مقررین نے شاعر اعظم ٹیگور کے فن اور زندگی پر روشنی ڈالی۔

مقررین میں مولوی سید مظفر علی زیدی، کے۔ ایس رامیں شرما، ایس۔ بلراقیا، عاقل حسین، نواب فرحت اللہ خاں اور صدر جلسہ جی گروداس صاحب کے نام قابل ذکر ہیں۔

جلسے کے آخر میں ایک غیر طرحی مشاعرہ بھی ہوا۔

(سکریٹری)

انجمن تعمیر اُردو امروہہ کا ادبی جلسہ انجمن تعمیر اُردو کا پندرہواں جلسہ زیر صدارت سید سبحی حسن صاحب، خواجہ کوثر علی کے دولت کدہ پر ہوا جس میں دل نواز احمد صدیقی رئیس نجمی، ریاست اختر، آفتاب احمد رضوی اچھے پال مادل، عنبر امروہوی، شہباز صدیقی اور تسیم عباسی نے مقالے، افسانے اور نظمیں پیش کیں۔ ریاست اختر کا افسانہ بہت پسند کیا گیا۔ (سرفراز نجمی، سکریٹری)

سالانہ رپورٹ جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان

(گذشتہ سے پیوستہ)

اُردو کی درخواستیں اور دستاویزات اُردو کی درخواستیں ہر محکمہ میں قبول کئے جانے کا حکم جاری ہو کر شائع ہو چکا جس کا نمبر F 34 (3) G A/A Gp مورخہ ۴ نومبر ۱۹۶۰ء ہے۔ یہ حکم راجستھان گزٹ مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۹۶۰ء حصہ چہارم حرف (II) میں شائع ہوا ہے۔ اس حکم میں لفظ درخواست تو ہے مگر دستاویز نہیں۔ پس اگر درخواست میں دستاویز شامل ہے تو مطالبہ پورا ہوا، ورنہ دستاویزات کے لئے اور جد و جہد کرنی ہے۔ گورنمنٹ اپنا کام کر چکی اب عمل کا انحصار خود اُردو والوں پر ہے۔

دستاویزات اُردو پہلے سے جو اُردو کی دستاویزیں گورنمنٹ کے ریکارڈ میں ہیں ان کی نقلیں اُردو میں دی جا رہی ہیں۔

امتحانات مقابلہ امتحانات مقابلہ میں ہندی بحیثیت لازمی مضمون کم ہو چکی ہے اور ان کے فارم میں ایک ایسا خانہ بڑھایا جا چکا ہے کہ امیدوار کس اقلیاتی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔

یونانی دواخانے ۱۹۵۸ء سے مسلسل خط و کتابت پر حکومت راجستھان کا جواب آیا کہ ایسا کوئی حکم کہیں سے جاری نہیں کیا گیا ہے کہ یونانی نسخے ہندی میں لکھے جائیں۔ مگر عملاً یہ بات غلط ہے، چنانچہ متعدد نسخے ہندی میں لکھے ہوئے حکام متعلقہ کو بھیجے جا رہے ہیں۔ یہ شہادتیں بھی موجود ہیں کہ ڈائریکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ راجستھان میں ہندی سرکاری زبان ہے اس لئے ہندی ہی میں کام کرنا ہوگا۔ متعدد جگہ اطبا کے ماتحت ان چپراسیوں کو عطار بنا دیا گیا ہے جو اُردو کا ایک حرف نہیں جانتے لہٰذا طبیب مجبور ہے کہ ہندی میں ہی نسخے لکھے لہٰذا اس بابت اُردو کے تحفظ کی حد تک انجمن ہٰذا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھے گی۔ اور اس سلسلے میں مقامی یونانی طبی کانفرنس کو اپنی اعانت کا یقین دلاتی ہے۔ کیونکہ یہ سوال اُردو ہی کی حفاظت کا نہیں ہے بلکہ انسانی جسم و جان کا بھی ہے۔ لہٰذا اس مطالبے کو کہ سرکاری یونانی دواخانوں میں طب یونانی کے نسخے اُردو ہی میں لکھے جائیں منوا کر چھوڑنا ہے۔

اُردو کی فلمیں سینٹرل فلم سینسر بورڈ۔ اُردو کی فلموں کو بھی ہندی ہی کا سرٹیفکیٹ دے رہا تھا۔ لہٰذا اس عمل کے خلاف اولین آواز بھی جے پور ہی سے اُٹھی اور مسلسل جد و جہد کا نتیجہ یہ ہے کہ اب اُردو کی فلموں کو اُردو ہی کا سرٹیفکیٹ ملنے لگا ہے۔ تاہم اس بابت کافی نگہبانی کی ضرورت ہے اور ہر لغزش مستانہ پر حریف کو سنبھالنا ہوگا۔

ساہتیہ اکیڈمی راجستھان راجستھان میں بمقام اودے پور یہ ادارہ کئی برس سے قائم ہے جس کا مقصد ہندی، سنسکرت، اُردو اور راجستھانی زبانوں کو ترقی دینا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ اس کو گورنمنٹ راجستھان سے مل رہا ہے، مگر اُردو پر اس نے اب تک کچھ خرچ نہیں کیا۔

انجمن ہٰذا نے اس کا دستور العمل طلب کیا تو جواب ملا کہ وہ گورنمنٹ کی منظوری کے لئے گیا ہوا ہے۔ نومبر ۱۹۶۰ء میں راقم الحروف دیگر ارکان وفد کے ساتھ جب اس ادارے کے پریزیڈنٹ شری جناردھن رائے ناگر۔ ایم۔ ایل۔ اے اور اس کے ڈائریکٹر سے اودے پور میں ملا تو گفتگو پر پتہ چلا کہ وہ اُردو کی کوئی کتاب اُردو رسم خط میں چھپوانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ صرف ہندی کا بھنڈار۔ اُردو کے شاہکار سے ہندی رسم خط میں بھرنا چاہتے ہیں اور اُردو رسم خط کو نظر انداز کر چکنے کا ان کا فیصلہ اٹل ہے۔ پس ظاہر ہے کہ اس طرح اُردو ترقی معکوس ہی کر سکتی ہے۔ اسی لئے اس ادارے نے آج تک نہ کوئی کتاب اُردو رسم خط میں شائع کی نہ اُردو کی کسی کتاب پر کوئی انعام دیا۔ نہ اُردو کے کسی رسالے یا اخبار کی چھپائی کا کوئی اقدام کیا۔ نہ اُردو کے کسی ادارے کو کوئی گرانٹ یا ایڈ دی۔ نہ اُردو کے کسی شاعر یا ادیب کو کوئی وظیفہ۔ نہ اُردو کا کوئی سمپوزیم کیا نہ کوئی اور تقریب انجام دی۔

اس ادارے کے مختلف شعبوں کی متعدد کمیٹیاں ہیں مگر کسی میں بھی کوئی کام اُردو کے متعلق نہیں ہوا۔ ہمیں جہاں تک علم ہے تین مختلف کمیٹیوں میں صرف ایک ایک اُردو داں صاحب بطور ممبر شامل ہیں۔ مگر ایک آواز کیا اثر کر سکتی ہے جبکہ یہ فیصلہ اٹل ہو کہ اُردو رسم خط کو دخل نہیں دیا جائے گا۔

دراصل اُردو کی حق تلفی کے لئے یہ ادارہ اُردو والوں کی نظر سے اوجھل ہے۔ خود اُردو والے فیصلہ کر سکتے ہیں کہ صرف اُردو خواندہ لوگ ایسے کتنے ہیں جو اس ادارے کی نوعیت اور وقتاً فوقتاً کی کارروائی سے باخبر ہوں اس لئے کہ اُردو میں اس کا کوئی لٹریچر نہیں اور جو رسالہ اس کا اپنا نکلتا ہے وہ سنسکرت آمیز ہندی میں شائع ہوتا ہے اس لئے اُردو والوں کے کچھ پلے نہیں پڑتا۔

اس ادارے کو راجستھان سرکار جو گرانٹ دیتی ہے وہ خزانہ عامرہ سے دی جاتی ہے۔ جس میں اُن لوگوں کے ادا کردہ ٹیکس بھی ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اکیڈمی اُردو کی ترقی و ترویج اور اُردو کی انجمنوں اور اُردو کے ادیبوں اور اُردو کے مصنفوں اور شاعروں کو کوئی امداد نہ دے۔ بحالت موجودہ تو یہ صورت ہے :-

محفل اُن کی ساقی اُن کا ۔ آنکھیں اپنی باقی اُن کا

اس سلسلے میں ہم اپنے دوست طوطی راجستھان منشی جنہ بہاری لال صبا۔ اور اپنے مخلص رکن پروفیسر پریم شنکر سریواستو سے استدعا کریں گے کہ وہ اُردو کے لئے مزید سعی فرمائیں تاکہ اُن پر جو حق اور قرض اُردو کا ہے وہ ادا ہو جائے۔

انجمن ہٰذا بھی اب زیادہ انتظار نہ کرے گی اُردو کے حق کی خاطر ہر مناسب معقول اور پُر امن سعی کرے گی۔

اس قدر التماس کے بعد مستدعی ہوں کہ امور مندرجہ بالا کا تصفیہ فرمانے کی زحمت فرمائی جائے۔ ۱۲ ۳/۶۱

مخلص۔ احترام الدین احمد شاغل

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان

حامد چھپروی

اکبر الہ آبادی کے دو غیر مطبوعہ خطوط

ایک یورپین مصنف کا خیال ہے کہ "ایک شخص کی روح اس کے خطوط میں برہنہ نظر آتی ہے"۔ ایک مورخ کا مشہور قول ہے کہ "کسی بھی انسان کے بارے میں جاننے کے لئے اس کے خطوط ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں"۔ حقیقت ہے کہ شخصیت خطوط میں بے نقاب ہوتی ہے۔ دور جدید انھیں خطوط کے ذریعے بے انتہا ادبی گتھیوں کو سلجھانے میں کامیاب ہوا ہے۔ غالب کی حقیقی شخصیت ان کے خطوط میں جلوہ گر ہے۔ اور تحقیق جدید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غالب وہی ہیں جو اپنے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ اکبر کے ساتھ بھی کم و بیش یہی بات ہے۔ دنیائے شاعری میں وہ طنز و مزاح کے بادشاہ تسلیم کئے جاتے ہیں لیکن اپنے ان دو نجی خطوط میں وہ نہایت سنجیدہ و متین انسان نظر آتے ہیں۔ ان خطوط کی اس جہت سے بڑی اہمیت ہے۔ یہ ہمارے لئے فکر و نظر کا نیا عنوان پیش کرتے ہیں کہ ان دو متضاد تصویروں میں کون سی تصویر حقیقی ہے؟ یہ دونوں خطوط اکبر کے نجی خطوط ہیں، جنھیں انھوں نے بہار کے مشہور ادیب و شاعر جناب فضل حق آزاد کو لکھا تھا۔ قبل اس کے کہ میں خط نقل کروں، فضل حق آزاد کی شخصیت کے متعلق کچھ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

سید فضل حق صاحب آزاد سنہ [illegible]ء بمقام شاہو بیگہ ضلع گیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا نام محمد فدا حسین تھا آپ کا خاندان شرافت و نجابت کے لحاظ سے صوبہ بہار کے سادات طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا۔ جب آپ کی عمر ۵ سال کی ہوئی تو فدا حسین صاحب نے قاری محمد جان صاحب کو جن کی قرأت کا شہرہ سارے ہندوستان میں تھا، دوسو روپیہ ماہوار پر لکھنؤ سے بلایا۔ قرآن شریف کی تعلیم آپ نے انھیں سے حاصل کی۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم بہار کے سر سید یعنی جناب قاضی سید رضا حسین صاحب کے زیر سایہ حاصل کی۔ تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں اپنے والد محترم اور اُستاد معظم (قاضی سید رضا حسین صاحب) کے ساتھ کلکتہ تشریف لے گئے آپ فارسی و اُردو کے بہت اچھے ادیب و شاعر تھے۔ آپ کی نگارشات ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہوا کرتی تھیں، خود بھی پٹنہ سے ایک ہفتہ وار رسالہ "تاج" نکالتے تھے ۲۳؍ [illegible] ۱۹۵۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ اب جناب اکبر کے خطوط ملاحظہ فرمایئے۔[1]

پہلا خط:-

الہ آباد - ۱۸؍ ستمبر سنہ ۱۲ء

مکرمی

مدت کے بعد ایک دوست نے زمیندار میں آپ کی نظم سنائی۔ ماشاء اللہ۔ مجھ کو معلوم نہ تھا کہ آپ کہاں تشریف فرما ہیں۔ میں روز افزوں ضعف و افسردہ دلی میں مبتلا ہوں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ آپ ایسے اہل دل اور لائق بزرگوں سے کبھی خط و کتابت کر لیتا ہوں۔ وہ وقت دور نہیں کہ دنیا ہم کو بھول جائے گی نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ الٰہی عاقبت بخیر کرے۔ دعا فرمایئے گا۔ اپنی خیریت کہئے۔

اکبر حسین

بعض حضرات خود آ کر کچھ خرافات لکھوا لے جاتے ہیں بعض شدت اصرار سے کچھ طلب کر لیتے ہیں ورنہ ہرگز دل نہیں چاہتا کہ کچھ کہوں، سب کچھ کہہ چکا۔ اب تو زمانہ ہی اور ہے۔ جو جانتا ہوں بھول سکتا تو بھول جاتا۔

نہایت اصرار سے حصہ دوم بھی میرے خرافات کا چھپ گیا ہے زار خائی ہے اور کیا۔

دوسرا خط:-

الہ آباد - ۱۳؍ فروری سنہ ۱۳ء

مکرمی۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ

آپ کی خیریت مدت سے نہیں سُنی دل کو قلق ہے۔ جب تک زندہ ہوں حواس درست ہیں آپ ایسے صاحبوں کی یاد لازمی ہے۔ آپ نے میرے اس شعر پر "جو مرض ہے مجھ کو لاحق" الخ خوب نظر فرمائی اور اس کو یاد رکھا۔ اس سے زیادہ کیا قدر دانی ہو سکتی ہے۔

پبلک کے اصرار سے دوسرا حصہ خرافات کا چھپوانا پڑا۔ جرأت نہ ہوئی کہ پیش کروں۔

گُل آورد سعدی سوئے بوستاں • بشوخی و فلفل بہ ہندوستاں

اگر اجازت ہو تو بھیج دوں۔ اور کہاں بھیجوں۔ آپ کے ایڈریس معلوم نہیں۔ آپ کبھی کبھی اور مقامات میں تشریف فرما رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے ترددات کو رفع اور زندگانی کو سہل کرے۔ آپ سے بھی دعا کا طالب ہوں۔

نیاز مند۔ اکبر حسین

---

[1] یہ دونوں خطوط جناب فضل حق صاحب آزاد کے صاحبزادے جناب عزیز عظیم آبادی کے پاس محفوظ ہیں۔ پہلا خط پوسٹ کارڈ پر ہے اور دوسرا لفافہ ہے۔

بقیہ

پنڈت اندرجیت شرما

اظہار غم کا بعد کو سودا کرے کوئی
پہلے اثر کی راہ تو پیدا کرے کوئی

ذوقِ نظر کے ضبط کا ہے اقتضا یہی
کچھ دل کے آئینہ ہی میں دیکھا کرے کوئی

آیا پیام ہوش پیام اجل کے ساتھ
کیا خاک زندگی کی تمنا کرے کوئی

پرواز کا تو بعد میں ہوتا ہے امتحاں
در تو قفس کا پہلے ذرا وا کرے کوئی

کھل گیا معمۂ حیات و ممات کا
اک انقلاب زیست میں پیدا کرے کوئی

دل سے مرے جو اٹھ گیا پردہ رُخِ مجاز کا
نقشہ نظر میں کھنچ گیا تیرے حریمِ ناز کا

بڑھتی رہی کہ دو قدم شوقِ زیاں کی کاوشیں
پڑتا رہا دلوں پہ جو سایہ رُخِ مجاز کا

سجدے در حبیب پہ کرتے رہے تمام عمر
پھر بھی ادا نہ ہو سکا ہم سے تو حق نماز کا

خوابِ گراں سے کھل گئی آنکھ ہی ذوقِ دید میں
آتا تھا کان میں مرے نغمۂ جاں نواز کا

اٹھی صدائے درد کیا دل سے کہ نغمہ بن گئی
تارِ نفس نے دے دیا کام جو تارِ ساز کا

زیست وہ کیا کہ جس میں دل محو رہے سکون میں
موت وہ کیا کہ نظم ہو جس میں سکوت ساز کا

حقیقت سے بیگانہ دور ہوں میں • محبت میں گو مسرور ہوں میں
مری فطرت ہے وقف خاکساری • تکبر کے سبب منصور ہوں میں
زمانے پر حکومت چاہتا ہوں • طبیعِ نفس ہوں مجبور ہوں میں
صداقت کی ضیا پاشی ہوئی جب
تو دیکھا حبل میں مستور ہوں میں

پبلشر نذیر حسین پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا